

خدائے سخن میر تقی میر کے مرثیے

کہتے ہیں کہ ہر بڑے منہ کی چھوٹی بات بھی بڑی ہوتی ہے۔ دنیائے ادب میں عظیم شاعروں کا ہر شعر اپنا آپ مقام رکھتا ہے۔ اگر اردو شاعری کے خدائے سخن میر تقی میر ہیں تو پھر ان کا کلام صحیفہ سخن اور ان کے کلام کا ہر شعر آیت سخن کی مصداق ہونا چاہیے لیکن افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اردو کی دنیائے سخن میں بقول میر انیس۔

عالم ہے مکدّ رکوائی دل صاف نہیں ہے

سب کچھ ہے اس دنیا میں بس انصاف نہیں ہے

میر کی تصنیفات کی تعداد زیادہ ہے جس کا ذکر ہماری گفتگو کا موضوع نہیں۔ آج میر کے انتقال کے دو سو برس بعد بھی میر شناسی کے بہت سے پہلورشن نہ ہو سکے اگرچہ اردو کے تقریباً ہر مشہور و معروف نقاد نے میر کی عظمت کا اقرار کیا ہے، اگر کسی تذکرہ نگار جیسے مصطفیٰ خان شیفتہ نے گلشن بے خار میں میر کی شاعری میں رطب و یابس کی طرف اشارہ کیا ہے تو اس کی توضیح بھی۔ ”درید بیضا ہمہ انگشت ہائیک دست نیست“ کہہ کر کر دی ہے۔

میر صاحب نے کم بیش ہر صنف سخن میں اپنی شاعری کے جوہر دکھائے ہیں۔ اگرچہ اردو شاعری میں غزل کا دوسرا نام میر تقی میر ہے لیکن اردو شاعری کی وہ اصناف جو بگڑی اور معمولی تھیں ان کو بھی میر صاحب نے کمال کے منصب پر بٹھا دیا۔ غزل ہو کہ مثنوی، قطعہ ہو کہ رباعی، قصیدہ ہو کہ مرثیہ ہر شعر حسن یوسف ہے جس کو بازار مصر میں پیش ہونا چاہیے۔ ہر لفظ میر کے صحیفہ کا سند ہے جیسا کہ خود میر نے کہا ہے۔

اس فن میں کوئی بے تہ کیا ہو مرا معارض

اول تو میں سند ہوں پھر یہ مری زبان ہے

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

میر عشق اور غم دولت کے شاعر ہیں۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے

رنج و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

مرثیے دل کے کئی کہہ کے دیئے لوگوں کو

شہر دلی میں ہے سب پاس نشانی اس کی

اگرچہ اوپر کے شعر میں مرثیہ لغوی معنی میں استعمال ہوا لیکن ہماری گفتگو درحقیقت اصطلاحی معنی مرثیہ یعنی وہ نظم جو شہدائے

کر بلا سے متعلق ہے ہوگی۔

بڑے تعجب کی بات ہے کہ میر صاحب کے مرثیوں کا مجموعہ پہلی بار آج سے صرف ترسٹھ سال قبل ۱۹۵۰ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا جس کو پروفیسر مسیح الزماں صاحب نے مرتب کیا تھا۔

میر صاحب کے مرثیوں سے نو مرثیوں کے صرف مطلع کے بندوں کو پہلی بار ۱۹۲۸ء میں رسالہ نیرنگ رام پور نے میر نمبر میں شائع کیا پھر انجمن ترقی اردو نے چھ مرثیے اور ایک سلام کو اردو اپریل ۱۹۳۱ء میں شائع کیا۔ اگرچہ کلیات میر کے قدیم نسخوں میں ان کے مرثیے اور سلام نظر آتے ہیں۔ ہماری تحقیق کے مطابق آج بھی میر صاحب کے بعض مرثیے اور سلام غیر مطبوعہ قدیم قلمی نسخوں میں موجود ہیں جس کی نشان دہی محقق رثائی ادب پروفیسر اکبر حیدری نے ”اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقاء“ میں کی ہے۔ انشاء اللہ راقم بہت جلد خدائے سخن میر کے تمام رثائی کلام کو شائع کرنے کی توفیق حاصل کرے گا۔

میر کے مطبوعہ مرثیوں، سلاموں اور نوحوں کی تعداد کچھ اس طرح ہے۔ (۱) کل مرثیہ ۳۱، جس میں ۲۷ مرثیے مربع شکل میں، دو مرثیے مسدس کی شکل اور ایک ایک مرثیہ ترکیب بند اور ترجیح بند کی شکل میں ہے۔ (۲) کل سلام پانچ عدد۔ (۳) نوحوں کی تعداد تین ہے۔ مطبوعہ مرثیوں، سلاموں اور نوحوں کے اشعار کی تعداد ۱۶۸۱ ہے۔

میر کے مرثیوں پر بہت کم لکھا گیا اگر ان دو سو سال کے تشریحی، تنقیدی اور حقیقی اوراق کو جمع بھی کریں تو مشکل سے ان کی تعداد بیس (۲۰) صفحات سے زیادہ نہ ہوگی۔ سچ تو یہ ہے کہ ناقدین ادب نے میر کے مرثیوں پر توجہ نہ کی ورنہ وہ یہ نہیں کہتے کہ ”میر خود روتے ہیں دوسروں کو رلا نہیں سکتے ان کے یہاں مرثیہ ضمنی حیثیت رکھتا ہے۔“ یہ ضروری نہیں کہ میر کے مرثیوں کا ان کی غزلوں سے تقابل کیا جائے کیوں کہ یہ تقابل ممکن نہیں البتہ میر کا انداز جس کا اعتراف شیخ ذوق نے کیا ہے۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب

ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

یا جس کی حسرت، حسرت موہانی نے کی ع ”میر کا شیوہ گفتار کہاں سے لاؤں“ میر کا وہ انداز جس میں بقول مصنف ”طبقات الشعراء“ خوش طبعی، خوش فکری، محاورہ بندی، جدت نگاری، رنگینی مضمون، تلاش الفاظ جرب و شیرین اور سادہ گوئی شامل ہے، تمام تر ان کے مرثیوں میں موجود ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مرثیے کی تقلیدیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ رنگ حسن، لفظوں کے پیرہن سے نظر آئے اور عطار کے لونڈے سے دوالی جائے بلکہ یہاں پڑھنے والے کو اخلاق اور کردار کے اعلیٰ اقدار سے ایسا ہی ہم کنار کر دیا جاتا ہے وہ بھی نور کے راستے کا درخشاں پیکر بن جاتا ہے۔

”نقد میر“ میں ڈاکٹر عبداللہ نے جو انداز میر کی پانچ عام خصوصیات بتائی ہیں وہ تمام مرثیہ میر میں ہمیں نظر آتی ہیں یعنی میر کے

مرثیوں میں:

اول۔ خلوص اور صداقت ہے جس کی وجہ سے مضامین میں قطعیت پیدا ہوتی ہے۔

دوم۔ منظر کشی اور جذبات کی مصوری کے کامیاب حصے موجود ہیں۔

سوم۔ مرثیوں کے مکالمے اور بول چال کے انداز میں لہجہ عام موجود ہے۔ یہاں ہم حسب مراتب بھی دیکھ سکتے ہیں۔

چہارم۔ میر کے مرثیوں میں طرز ادائیگی استدلالی انداز سے زیادہ بیانیہ اور خطابیہ ہے۔ جو میر کے انداز کی شناخت ہے۔
پنجم۔ محاسن زبان جو بقول میران کے کلام کی شناخت بھی ہے۔

جو دیکھو مرے شعر تر کی طرف
تو مائل نہ ہو پھر گہر کی طرف

اردو زبان کی تاریخ میں جا بجا جھول نظر آتے ہی شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ جن علمائے ادب نے تاریخ مرتب کی انھوں نے شعری حوالوں کو مخصوص وہ تاریخی اور سماجی حوالے جو مرثیوں میں نظم ہوئے تھے ان پر چنداں توجہ نہ کی ورنہ اردو کی تاریخ کے ساتھ ساتھ سماج کی تصویر کے نقش بھی مستند طور پر ثبت ہو سکتے تھے۔

اٹھارہویں صدی میں دہلی کی عزاداری کا آنکھوں دیکھا حال میر کے مرثیے میں دیکھئے۔

گھر سیاہ اپنے کریں گے اس عز میں سب امیر
اس کے ماتم میں بہت سے لوگ ہوئیں گے فقیر
سینہ کوبی کرتے کوچوں میں پھریں گے خرد و پیر
عورتیں بے تاب نکلیں گی گھروں سے موفشاں
نعل سینوں پر جڑیں گے اور سر پھوڑیں گے لوگ
کھینچیں گے کتنے الف داغ اور کتنے لیں گے جوگ
اچراں ماتم سرا میں رکھیں گے اس شہ کا سوگ
حلقہ حلقہ لوگ ہوں گے نوحہ ہو گا درمیاں

اس زمانے میں دہلی میں لوگ محرم میں نیلے رنگ کے کپڑے پہنتے تھے۔

گریہ وزاری پہ رکھیں گے خرد منداں اساس
جامہ آبی مقرر ہو گا ہر اک کا لباس

ایک اور مرثیہ میں محرم کے جلوس اور مجلسوں میں ماتم منانے کے طریقوں کا یوں بیان کرتے ہیں۔

الف داغ کھینچے کہیں جائیں گے
کہیں نعل سینوں پر جڑوائیں گے
دُہل کی صدا چلچکی کا وہ شور
قیامت سی رکھیں گے ہر چار اور
جواں چھاتیاں اپنی کوٹیں گے زور

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں آج بھی دنیا میں سب سے زیادہ مشہور اور سب سے زیادہ پڑھا جانے والا مرثیہ فارسی زبان میں صفوی حکومت کے ملک الشعراء ملا محتشم کاشفی کا ہے جو ترکیب بند ہیئت میں لکھا گیا ہے اور بارہ (۱۲) بند پر مشتمل ہے جس کا مطلع ہے۔

باز این چه شورش است کہ در خلق عالم است
باز این چه نوحہ و چه عزا و چه ماتم است

میر تقی میر نے بھی اس کاشفی کے مرثیہ سے متاثر ہو کر ترکیب بند ہیئت ہی میں بارہ بند کا شاہکار مرثیہ لکھا۔ اگرچہ اس مرثیہ کا لہجہ بھی محتشم کاشفی کے لہجہ سے میل کھاتا ہے لیکن یہ میر صاحب کی قادر الکلامی اور معجز بیانی ہے کہ تمام مرثیے کے مضامین کاشفی کے مرثیے

کے مضامین سے جدا ہیں اور میر صاحب کے مرثیہ میں محتشم کاشفی کے مرثیے سے زیادہ درد ہے۔

میر صاحب کا مطلع اور مقطع محتشم کاشفی کے مرثیہ کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ مرثیے کے کچھ شعر یہ ہیں۔

پھر کیا یہ دھوم ہے کہ جہاں ہے سیہ تمام
پھر کیا یہ ماجرا ہے کہ ہے صبح جیسے شام
پھر کیا ہے یہ غبار کے اٹھتے ہیں دل سے جوش
پھر کیا یہ سچ ہلہ ہے کہ حیران ہیں خاص و عام
کس کا کیا ہے تازہ حوادث نے ایسا خون
ہر صبح آفتاب پئے ہے لہو کا جام
زہراً کے دل کا لخت محمدؐ کا نور عین
اسلامیوں کے ظلم سے مارا گیا حسینؑ
محتشم کا مقطع ہے۔

خاموش محتشم کہ دل سنگ آب شد

بنیاد صبر و خانہ طاقت خراب شد

میر صاحب فرمائے ہیں۔

خاموش میر شمع رسالت کی بجھ گئی
خاموش میر بس یہ جگر سوز غم نہ کہہ
خاموش میر بولنے کی جا نہیں ہے یہ
خاموش میر کرتی ہے دل چاک تیری بات
میر انیس نے کہا۔

لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہووئے

مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووئے

میر کہتے ہیں۔

کہوں یہ واقعہ آگے تو غم ہو

دلوں کو میر صد گونہ الم ہو

قصہ کوتاہ میر کہاں تک آل عبا کے دکھ سینے

رویے کڑھے مایم کرے، کوٹھے چھاتی سر دھنیے

جیسے کباب بروئے آتش جلئے شام و سحر بھنیے

چپ رہ ظالم خوب نہیں اب آگے بات بڑھائی ہوئی

یہ کہہ کے گئے آگے روتے ہوئے غم دیدہ

اب تو بھی قلم رکھ دے اے میر ستم دیدہ

بس گریہ سے خامے کے کاغذ تو ہے غم دیدہ
دیوانی کر اس جا پر یہاں عقل ہے دیوانی
میر کے مرثیوں کے بارے میں یہ بات بھی نہ جانے کیوں مشہور ہو گئی ہے کہ یہ مراثنی ان کی آخری عمر کی تصانیف ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض مرثیے میر صاحب نے عالم پیری میں کہے ہیں جیسا کہ ان مرثیوں سے ظاہر ہے۔

مدت تک کی ہرزہ سرائی
شہرت ہوئی پر ذلت اٹھائی
بس میر کب تک پیری بھی آئی
اب مرثیہ ہی اکثر کہا کر

ایک دوسرے مرثیہ کے مقطع میں کہتے ہیں۔

ہر چند شاعری میں نہیں ہے تیری نظیر
اس فن کے پہلوانوں نے مانا تجھی کو میر
پران دنوں ہوا ہے بہت تو ضعیف و پیر
کہنے لگا جو مرثیہ اکثر بجا کیا

میر کے چھ دیوان اس بات کی مستند سند ہیں کہ میر ہی کے ابتدائی اور آخری کلام میں زبان اور طرز بیان میں فرق آچکا تھا جس سے شعر و زبان کے ارتقا اور تبدیلی کا ثبوت ملتا ہے چنانچہ جب ہم نے مراثنی میر کا بغور مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ بعض مراثنی ان کے ابتدائی کلام معلوم ہوتے ہیں اگرچہ اکثر مرثیوں اور سلاموں سے ان کی پختہ کلامی اور کہنہ مشقی ظاہر ہے۔ بعض مرثیوں میں وہ الفاظ بھی نظر آتے ہیں جنہیں میر صاحب نے بعد میں ترک کر دیا تھا۔

میر کے مرثیوں میں برصغیر کے سماج کی جھلکیں نظر آتی ہیں۔ میر صاحب نے حضرت قاسم کی شادی کی عکاسی کرتے ہوئے ہندوستانی رسوم، برات، سہرا، حنا بندی، مصحف و آرسی، ساچق، نیگ وغیرہ کو بڑے موثر طریقہ پر نظم کیا ہے۔ اگر میر صاحب اپنے مرثیوں میں یہ ہندوستانی سماجی قدروں کو پیش نہ کرتے تو مرثیوں میں وہ گداز و سوز باقی نہ رہتا اور مرثیہ کسی پردیس کی حکایت بن کر رہ جاتا اس میں تقلیدی اور تاثیر گنجائش نہ رہتی اسی کامیاب تجربہ کی بنیاد پر فلک مرثیہ کے آفتاب و مہتاب یعنی میر انیس اور مرزا دبیر نے مرثیہ کا تاج محل تعمیر کیا۔

حضرت قاسم جو کر بلا کے دولہا ہیں سراپا کے دو شعر دیکھئے

دولہا اگر تھا ظاہر نو یلا
لیکن نہایت بے کس اکیلا
دل کے الم سے، رخ زرد چوں زر
آنسو کا سہرا چہرے کے اوپر

میر کے مرثیوں میں جا بجا قادر الکلامی اور شوکت الفاظ کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ مرثیہ مرثیوں میں جو میر کے مرثیہ گوئی کا رواج تھا تراکیب اور توانی ملاحظہ کیجئے۔

پدر ساقی کوثر جسکا اسکو تشنہ لب ماریں
 حرم کا جو ہے عزت دار سو محتاج چادر ہے
 امام عارف و عامی نبی کے دین کا حامی
 کہاں حیدر کہ جو دیکھے وہی یہ ناز پرور ہے
 قیامت کا ساہنگامہ ہے برپا اک بیاباں میں
 بلا ہے، فتنہ ہے، آشوب ہے اک شور ہے شر ہے
 نکلتی آنکھ سے یاقوت کی سی تختیاں دیکھے
 بلا لے پاس ہمکو جلد اپنے ہی تو بہتر ہے
 لپٹ سی ہونٹ کو لگنے لگی ہے گرمی دم سے
 ٹپکتا آنکھ سے آنسو جو ہے گویا کہ اگلر ہے
 کہاں تک نوحہ و زاری کرے گا ہر گہہ و بیگہ
 کہ جو آنسو گرے ہے آنکھ سے یاقوتِ احمر ہے

محمدؐ جسکا نانا اسکو بیکس کر کے سب ماریں
 سب جو بخشش عالم کا اس کو بے سبب ماریں
 شرہ ہر دو جہاں زیر نگین، معروف اور نامی
 سر اس صبح سعادت کا سناں پر لے چلے شامی
 عجائب درہمی آئی ہے اس جمع پریشاں میں
 تری اس چین سے کیونکہ لگی ہے آنکھ میدان میں
 جگر ٹکڑے ہوا ہے کب تلک یہ سختیاں دیکھے
 تس او پر شام کے لوگوں کی یہ بد سختیاں دیکھے
 نہیں ان کلفتوں کی تاب لائی جاتی اب ہم سے
 دردنی جل گئی شاید ہماری آتشِ غم سے
 جو کچھ اے میر آگے چل کر پیش آیا انھیں مت کہہ
 یہیں سے رنگ تیرے دل کا پیدا ہے بس اب چپ رہ